ترجمۃ القرآن از عبد السلام بن محمد کے خصائص و ممیّزات اور تفسیر القرآن الکریم کا تحقیقی مطالعہ (حصہ اول)

یاسر فاروق *

Abstract

Since the revealing of holy quran, many scholars did lot of services to convey Allah almighty's message regarding his teachings to human being. Many scholars wrote Quranic exegesis and interpretations, while the other hand hundreds of people translated it into other languages so that people may be able to learn its teaching according to their languages. In sub-continent, shah wali ullah and his sons got primary position by contributing in this regard. They translated holy quran first time in Urdu and Persian. This was the time of need to translate it. After them, a chain of translations and interpretation has been recognized. All of these had many features & characteristics but the translation and interpretation of Abdul Salam bin Muhammad, which we are presenting in this research are more valuable and much better then all. In his translation he secured a huge attention by scholars of Pakistan. Because his translation has many qualities and features i.e. accuracy of meaning, exact meaning of Arabic word, meaning of silent word from text, idiomatic translation, sequence of meaning etc. His interpretation of Quran also has many characteristics and features which highlights it among many other interpretations. In this paper, we've presented a research on the methodology of his great translation & interpretations along with their features and qualities.

Keywords: *translation, tafsir ul Quran al Karim, Abdul Salam bin Muhammad, Sub-continent, idiomatic.*

* ڈاکٹر یاسر فاروق، لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ میونسپل ڈگری کالج، فیصل آباد۔

تعارف

برِ صغیر میں ترجمہ قرآن کی جس روایت کا آغاز خانوادہ شاہ ولی اللٰہی نے کیا اس کے اثرات پاک و ہند کے تمام مکاتبِ فکر پر مرتب ہوئے۔ قرآن مجید کے تراجم کی ضرورت و اہمیت کو محض مسلم علماء نے ہی محسوس نہ کیا بلکہ غیر مسلم محققین نے بھی اس فن میں خوب داد وصول کی۔ اسی طرح دنیا کی ہر مشہور زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا گیا اور اس فن کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو چہار سو پہنچانے کی غرض سے روز بروز ترقی ملتی رہی۔ تاہم یہ بات بہت حد تک اب عیاں ہوتی چلی جا رہی ہے کہ اکثر تراجمِ قرآنی جو ابتدائی حیثیت سے منصہ شہود پر آئے وہ ایک "ضرورت" کے تحت تھے کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیمات ان کی ہی زبان میں بہم پہنچائی جا سکیں اور وہ خود اس کے اسرار و رموز پر مطلع ہو سکیں۔ اس زاویہ نگاہ کی تائید بذاتِ خود ان تراجم کو دیکھنے سے ہوتی ہے، نیز مختلف تراجم کا تقابلی مطالعہ بھی اس رجحان کو مزید تقویت دیتا ہے۔ راقم الحروف اس سلسلہ میں متعدد تراجم اور ان کے اسبابِ ترجمہ کو دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تراجم میں تنوع اکثر اوقات مسلکی، علاقائی، یا محض ترجمانی احوال کے پیشِ نظر ہوا ہے۔ اسی طرح بعض غیر مسلموں کے یہاں مذموم مقاصد پیشِ نظر تھے جس کے لیے انھوں نے اپنی مرضی سے قرآن کے تراجم کیے اور پھر اعتراضات و اشکالات وارد کیے۔ پیشِ نظر مضمون پاکستان کے ایک معروف عالمِ دین اور استاذ القرآن والحدیث مولانا عبد السلام بن محمد (بھٹوی) حفظہ اللہ کے ترجمہ قرآن کے خصائص و ممیزات کو بیان کرنے کے متعلق ہے۔

موصوف عرصہ ۴۵ سال سے قرآن و حدیث کی تعلیم دے رہے ہیں اور فی الوقت مرکز طیبہ مرید کے میں پچھلے تیس سال سے صحیح البخاری کا درس دے رہے ہیں۔ [(۱)] یہ ترجمہ و تفسیر ان کی اس پورے دورانیہ میں کی گئی محنتِ شاقہ کا نچوڑ اور حاصلِ مطالعہ ہے۔ اولاً انہوں نے ترجمہ ہی کیا تھا جو سن ۲۰۰۷ء میں پہلی بار طبع ہوا تھا بعد ازاں لوگوں کے اصرار پر تفسیر القرآن الکریم لکھی جو حد درجہ مقبول ہوئی۔ تفسیر دعوۃ القرآن از ابو نعمان سیف اللہ خالد میں بھی انہی کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ اس تحریر میں موصوف کے اسی ترجمہ کی خصوصیات و امتیازات اور تفسیر کا منہج و اسلوب بھی پیش کیا جائے گا تاہم اصلاً ترجمہ قرآن کو موضوع بنا کر اس کی افادیت کو واضح کیا جائے اور اس کی ممیزات پیش کی جائیں گی، تبعاً ان کی تفسیر کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

مولانا عبد السلام بن محمد کی تفسیر کے صفحہ کی ترتیب یہ ہے کہ اوپر قرآنِ مجید کا متن، اس کے نیچے ترجمہ اور پھر اس کے نیچے تفسیر ہے۔ چنانچہ ہماری اس تحقیق میں اول ترجمہ کو focus کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ تفسیر سے توضیحات ذکر کی جائیں گی۔ اس کے بعد ایک الگ مبحث (جو مستقل ایک مضمون کی شکل ہے) قائم کرتے ہوئے تفسیر القرآن الکریم کا عمومی منہج و اسلوب پیش کیا جائے گا۔

ترجمہ کی ضرورت اور اسباب

مترجم (مولانا عبدالسلام بن محمد) نے ترجمہ کے شروع 'عرضِ مترجم' کے عنوان سے اپنے ترجمہ کی ضرورت واسباب اور خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور پھر تفسیر کے شروع میں اسی عرضِ مترجم کو دوبارہ نقل کر دیا ہے۔ ترجمہ قرآن کی ضرورت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اکثر حضرات کے تراجم بامحاورہ اور چند ایک لفظی ہیں، مگر ان تمام تراجم کے باوجود کام کی گنجائش باقی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں آنے والا کوئی لفظ کوئی حرف بے مقصد نہیں ہو سکتا، مگر اکثر تراجم میں کئی الفاظ کو چھوڑ دیا گیا ہے، الفاظ کی کمی بیشی کو ترجمے کے وقت ملحوظ نہیں رکھا گیا، الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے معنیٰ میں جو تاکید یا حصر پیدا ہوتا ہے اس کا خیال نہیں کیا گیا اور بعض تراجم میں ایک جگہ ان میں سے کسی چیز کا خیال رکھا گیا ہے تو دوسری جگہ اس کا خیال نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ بعض تراجم میں قرآن کے الفاظ سے زائد الفاظ ترجمے میں داخل کر دیے گئے ہیں، جنہیں تشریح کہا جا سکتا ہے، کلام اللہ کا ترجمہ نہیں۔"(۲)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مترجم کے پیشِ نظر ایک وقیع اور جان دار سبب تھا جس کی وجہ سے انہوں نے قرآن کا ایک اور ترجمہ لکھنا شروع کیا، بلکہ وہ خود دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس لیے ایسے ترجمے کی ضرورت باقی ہے جس میں قرآنِ مجید کے کسی لفظ کا ترجمہ نہ چھوڑا گیا ہو اور اس سے زائد ترجمہ داخل نہ کیا گیا ہو۔ میں نے اپنی طاقت کے مطابق یہ کام کیا ہے، مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں حق ادا نہیں کر سکا اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص یہ حق ادا نہیں کر سکتا، کیونکہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ سو فیصد ممکن نہیں۔"(۳)

الغرض، مترجم نے جس قدر جانفشانی اور عرق ریزی سے یہ ترجمہ کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ برصغیر میں لکھے گئے قدیم و جدید تمام تراجم کے ساتھ اس کے تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اس کی افادیت بہت زیادہ نظر آئی۔ راقم الحروف نے گیارہ بامحاورہ و لفظی تراجم کے ساتھ مقارنہ کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ پاک و ہند میں لکھے گئے اکثر تراجم کی بہ نسبت یہ ترجمہ قرآن فائق اور زیادہ موزوں برائے مطالعہ و تدریس ہے اور مترجم یقیناً اپنے دعویٰ اور کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ذیل میں اس ترجمہ کی خصوصیات اور مترجم کی تفسیر القرآن الکریم کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس سلسلہ میں راقم نے اپنی معروضات کو ذیلی محاور و مباحث کے تحت پیش کیا ہے؛

۱۔ مبحث اول؛ ترجمہ قرآن کے صرفی لحاظ سے خصائص۔

۲۔ مبحث دوم؛ ترجمہ قرآن کے نحوی لحاظ سے خصائص۔

۳۔ مبحث سوم؛ ترجمہ قرآن کی لفظی معنویت اور اثرات۔

۴۔ مبحث چہارم: تفسیر القرآن الکریم کا منہج واسلوب اور امتیازات۔ (اس مضمون کا حصہ دوم ملاحظہ ہو)

۵۔ خاتمہ البحث ونتائج

مبحث اول: ترجمہ قرآن کے صرفی لحاظ سے خصائص

ا۔ الفاظ کی بناوٹ میں حروفِ زوائد کی رعایت

عربی زبان میں ایک معنیٰ کی ادائیگی کے لیے چونکہ کئی الفاظ ہوتے ہیں اس لیے ان کی معنویت کا اثر عام طور پر مترجمین پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ حالانکہ ذرا سا غور وفکر ان کے معنیٰ کی تعیین اور اس میں موجود تنوع کو واضح کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اسم فاعل، صفتِ مشبہ، صیغہ مبالغہ اور اسم تفضیل کے معانی اشتقاقی لحاظ سے تو یکساں ہوں گے تاہم ان میں یک گونہ تفاوت پایا جاتا ہے۔ اسم فاعل محض کام کرنے والی ذات کو ظاہر کرتا ہے، صفتِ مشبہ اس فعل میں دوام کو ظاہر کرتا ہے، صیغہ مبالغہ فاعلیت اور فعلیت کے معنیٰ میں حد درجہ زیادتی کو ثابت کرتا ہے جبکہ اسم تفضیل فاعلیت کے معنیٰ میں نسبتاً اور کسی کے مقابلہ میں اضافہ کو متضمن ہوتا ہے۔ [۴] چنانچہ مترجم موصوف نے ان سب کی رعایت رکھی ہے۔ بلکہ ابواب میں حروف کے اضافے کو بھی انہوں نے ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اگر کسی جگہ ثلاثی مزید فیہ کا صیغہ آیا ہے تو ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ اسی طرح افعال میں معنوی تاکید پیدا کرنے کے لیے عربوں کے ہاں جو نون (ثقیلہ وخفیفہ) استعمال کیے جاتے ہیں مترجم نے ان کی معنویت کو بھی خوب واضح کیا ہے۔ یہ اور اس قبیل کے دیگر امور کی تفصی درج ذیل ہیں:

الف: صیغہ مبالغہ کا ترجمہ

صیغہ مبالغہ میں ایک تو معروف 'فعّالٌ یا فَعُولٌ' کا وزن ہے اور دوسرا علماء صرف صفتِ مشبہ کو بھی دوام کے معنیٰ کو متضمن ہونے کی وجہ سے مبالغہ فی المعنیٰ کی علامت تصور کرتے ہیں۔ اس لیے فاعلٌ، فَعِیلٌ اور فعّالٌ میں معنوی فرق ہوتا ہے۔ اردو مترجمین نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا تاہم موصوف مترجم نے اس کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "بعض حضرات نے کچھ الفاظ کے ترجمے میں اس کا خیال رکھا ہے کچھ میں نہیں رکھا، بعض نے ایک لفظ کے ترجمہ میں ایک جگہ یہ بات ملحوظ رکھی ہے اور دوسرے مقامات پر ملحوظ نہیں رکھی۔ میں نے 'رحمان، رحیم، علیم، حکیم، عزیز، عفوٌ، غفور، توّاب' اور دوسرے تمام الفاظ میں، جہاں وہ آئے ہیں، اس بات کا خیال رکھا ہے" [۵]

مثال کے طور پر باب/لفظ 'غفر یغفر غُفراناً' کے ذیلی مشتقات میں اس کو ملاحظہ کیا جائے۔

اسم فاعل: آیت کریمہ ' غَافِرِ الذَّنْبِ ' میں لفظِ غافر کا ترجمہ "گناہ بخشنے والا" کیا ہے۔ [۶]

صفتِ مشبہ: آیتِ کریمہ ' اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ ' میں لفظِ غفور کا ترجمہ صفتِ مشبہ ہونے کی وجہ سے 'بے حد بخشنے والا' کیا گیا ہے۔ [۷]

مبالغہ: آیتِ کریمہ ' **وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ** ' میں لفظِ غفّار کا ترجمہ صیغہ مبالغہ ہونے کی وجہ سے 'بہت بخشنے والا' کیا گیا ہے۔ (۸)

اس کی مزید تفصیل سورۃ الفاتحہ کی آیتِ ' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ' میں **الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** ' کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے جہاں موصوف نے غزیر الفائدہ اور اصولی بحث کی ہے۔ (۹)

ب۔ خاصیاتِ ابواب (ثلاثی مزید فیہ وغیرہ) کا لحاظ

اہلِ عرب کے ہاں الفاظ کی بناوٹ کا معانی پر خاص اثر مرتب ہوتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ "**زيادة المباني دليل على زيادة المعاني**" کہ الفاظ کی زیادتی معنیٰ کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔ (۱۰) اگر کوئی لفظ باب ثلاثی مجرد (تین حرفی) میں سے ہے تو باب ثلاثی مزید فیہ (تین سے زائد حرفی) میں جانے کی صورت میں اس کا معنیٰ فعلیت میں زیادتی ہو جائے گی۔ چنانچہ مترجم موصوف نے اس اصول کا ہر اس لفظ پر پیشِ نظر رکھا ہے جہاں یہ قاعدہ منطبق ہوتا ہے۔ اس کی امثلہ ان کی ترجمہ میں بیسیوں مقامات پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ذیل میں چند ایک بطورِ نمونہ پیش کی جارہی ہیں:

۱۔ لفظ ' اسْ۔ تَوْقَدَ ' کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اسْ۔ تَوْقَدَ نَارًا " اَوْقَدَ نَارًا " کے معنی ہیں اس نے آگ جلائی۔ " اسْ۔ تَوْقَدَ " میں سین اور تاء زیادہ ہونے سے معنی میں اضافہ ہوگیا، اس لیے اس کا ترجمہ " خوب بھڑکائی " کیا ہے۔" (۱۱)

۲۔ لفظِ ' مُّطَهَّرَةٌ ' کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مُّطَهَّرَةٌ :باب تفعیل سے اسم مفعول ہے۔ ایک حرف کے اضافے کی وجہ سے " نہایت پاک صاف " ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی وہ ہر قسم کی ظاہری آلائشوں، مثلاً پیشاب، پاخانہ، تھوک، حیض وغیرہ سے اور باطنی آلائشوں مثلاً جھوٹ، حسد، کینہ وغیرہ سے پاک ہوں گی۔" (۱۲)

۳۔ لفظِ ' يُّقَتَّلُوْا ' کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا : باب تفعیل کی وجہ سے معنی میں زیادتی کے اظہار کے لیے ترجمہ میں "بری طرح " کا اضافہ کیا گیا ہے، اسی طرح "اَوْ يُصَلَّبُوْٓا' اور "اَوْ تُـقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ " میں بھی باب کا خیال رکھا گیا ہے۔" (۱۳)

اسی طرح مترجم نے اکثر مقامات پر ترجمہ کرتے ہوئے دلیل کے طور پر ابواب کی خاصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر لفظِ يُخٰدِعُوْنَ کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" یُخٰدِعُوْنَ باب مفاعلہ سے ہے جس میں مشارکت پائی جاتی ہے، اس لیے ترجمہ " دھوکا بازی " کیا گیا ہے۔ "(۱۴)

بسااوقات فائدے کے طور پر ابواب سے متعلق کوئی نکتہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اَلْمُمْتَرِیْنَ کے ذیل میں لکھتے ہیں؛

"اَلْمُمْتَرِیْنَ یہ "اِمْتِرَاءٌ" یعنی باب افتعال سے اسم فاعل کی جمع ہے، مصدر "مِرْیَۃٌ" (بمعنی شک) سے فعل مجرد نہیں آتا، بلکہ ہمیشہ باب افتعال سے آتا ہے۔ "(۱۵)

اسی طرح لفظ کے معنوی اثر کو بیان کرتے ہوئے اس کی تفسیر بھی لفظ کے مطابق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظِ یُّحَادِدِ کی توضیح یہ کرتے ہیں:

" اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّہٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ : "یُّحَادِدِ " یہ "حَدٌّ" سے مشتق ہے جس کا معنی "جانب" ہے۔ باب مفاعلہ عموماً مقابلے کے لیے آتا ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول ایک جانب ہوں اور یہ اس کے مقابلے میں دوسری جانب ہوں۔ آگے سوال کے طور پر ان کا انجام ذکر فرمایا کہ کیا انھیں یہ معلوم نہیں؟ سوال کا مقصد پوچھنا نہیں بلکہ بتانا ہے کہ یہ بات اتنی واضح ہے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے مقابلے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ "(۱۶)

الغرض، ترجمہ میں الفاظ کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے مترجم نے اس کو اپنی تفسیر میں جابجا واضح بھی کیا ہے اور اس کی تشریح و تفسیر میں معنویت کا بھرپور اظہار بھی کیا ہے۔

ج۔ الفاظِ تاکید کا معنیٰ

جن الفاظ یا افعال کے صیغوں کے معنیٰ میں تاکید پیدا کرنا مقصود ہو عربی زبان میں اس کے کئی طریقے ہیں۔ ان سب میں کسی حرف کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات یہ اضافہ مقصود بہا لفظ کے شروع میں، بسااوقات درمیان میں (جیسا کہ ابواب کی خاصیات بارے بیان ہو چکا ہے) یا پھر آخر میں کیا جاتا ہے۔ شروع میں جن الفاظ کا اضافہ ہوتا ہے ان میں خاص طور پر الفاظِ تاکید ' اِنّ، اَنّ، لامِ تاکید، حروفِ قسم' وغیرہ ہوتے ہیں اور آخر میں نون التوکید (ثقیلہ و خفیفہ) شامل ہیں۔ مترجم (عبد السلام بن محمد) لکھتے ہیں:

"میں نے تاکید کے عام مستعمل الفاظ کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً 'لام تاکید، نون ثقیلہ و خفیفہ، اِنَّ اور قد' کے لیے 'ضرور، بے شک، یقیناً، بلاشبہ، کوئی شک نہیں، ہر صورت، حقیقت یہ ہے، واقعہ یہ ہے، لازماً، فی الواقع، واقعی' وغیرہ جیسے الفاظ استعال کیے ہیں اور بعض اوقات لفظِ 'تو' کا استعمال کیا ہے، مثلاً یوسفؑ کے قول "اِنَّآ اذاً لَّظٰلِمُوْنَ" کا ترجمہ " یقیناً ہم تو اس وقت ظالم ہوں گے " (کیا ہے)۔ "(۱۷)

مترجم نے نونِ تاکید کی دونوں اقسام، لامِ تاکید اور اسی طرح اَداۃِ تاکید (اِنَّ واَنّ) کا ہر جگہ خیال رکھا ہے۔ ان کی امثلہ ذیل میں ملاحظہ کی جائیں؛

نونِ تاکید ثقیلہ: آیتِ کریمہ 'لَاَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ' کا ترجمہ 'میں ضرور ہی تمہارے بتوں کی خفیہ تدبیر کروں گا' کیا ہے۔ (۱۸)

نونِ تاکید خفیفہ: آیتِ کریمہ 'لَنَسْفَعًا (اصل میں لَنَسْفَعَن ہے) کا ترجمہ "ہم ضرور اسے پیشانی کے بالوں کے ساتھ گھسیٹیں گے' کیا ہے۔ (۱۹)

لام تاکید: سورہ یٰس کی آیاتِ کریمہ 'إِنَّآ إِلَيْكُمْ مُرْسَلُونَ' اور 'إِنَّآ إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ' کے تراجم میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اول الذکر کا ترجمہ 'بے شک ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں' کیا ہے اور ثانی الذکر کا ترجمہ 'ہم تمہاری طرف ضرور بھیجے ہوئے ہیں' کیا ہے۔ (۲۰) اس کی توجیہ کرتے ہوئے اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> "سورہ یٰس میں إِنَّآ إِلَيْكُمْ مُرْسَلُونَ اور إِنَّآ إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ کا ایک ہی ترجمہ کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے دوسری آیت میں 'لام' محض بے فائدہ ٹھہرتا ہے، جبکہ ایسا خیال کرنا بھی درست نہیں۔" (۲۱)

اگر حروفِ تاکید میں کسی قاعدہ و قانون کی رو سے تخفیف ہو تو اس کو بھی بیان کر دیتے ہیں اور ترجمہ میں اس کی اصل کی رعایت کرتے ہوئے تاکیدی معنیٰ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ اِنْ "دراصل "اِنَّكَ" تھا، تخفیف کے لیے کاف کو حذف کر دیا اور "اِنَّ" کو "اِنْ" کر دیا۔ اس کی دلیل "لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ" پر آنے والا لام ہے اور یہ عربی کا مسلمہ قاعدہ ہے، اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ "اِنْ" اور لام کے ساتھ تاکید اس لیے کی ہے کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ آپ یہ سب کچھ پہلے ہی جانتے تھے، جیسا کہ ہمارے کئی نادان بھائی کہتے ہیں، بلکہ دوسری جگہ فرمایا: (تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا) [ھود:۴۹] "یہ غیب کی خبروں سے ہے جنھیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو انھیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔" (۲۲)

د۔ الفاظ کی ساخت میں حروفِ زائدہ و محذوفہ کی وضاحت

دورانِ ترجمہ مترجم (مولانا عبد السلام بن محمد) نے قرآن مجید میں مذکور الفاظ کی ساخت کو بہت زیادہ مدِ نظر رکھا ہے۔ اگر کوئی لفظ اپنی اصل سے زائد حروف پر مشتمل ہے تو اس کے معنیٰ میں اس کو شامل کر دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی حرف حذف ہو گیا ہے تو اس کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کو واضح کر دیتے ہیں۔ ان کی امثلہ درج ذیل ہیں:

ا۔ لفظ کی زیادتی: آیتِ کریمہ 'اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ' میں لفظ "مَلَكُوْت" کا ترجمہ 'عظیم الشان

سلطنت' کیا ہے اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ : "مَلَكُوْتِ" یہ "مُلْكٌ" کے لفظ میں واؤ اور تاء کا اضافہ معنی میں وسعت کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "عظیم الشان سلطنت" کیا گیا ہے۔"(۲۳)

اس کی دوسری مثال: آیتِ کریمہ 'وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا' میں لفظ 'اَثَامًا' ہے۔ جس کا ترجمہ 'سخت گناہ' کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" إِثْمٌ " میں الف کے اضافے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، " سخت گناہ۔" اس کا معنی گناہ کی جزا بھی آتا ہے، یعنی سخت گناہ کی سزا پائے گا۔"(۲۴)

۲۔ لفظ کا حذف: آیتِ کریمہ 'وَاِلَيْهِ مَاٰبِ' کا ترجمہ ' اور اس کی طرف ہی میرا لوٹنا ہے' کیا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" وَاِلَيْهِ مَاٰبِ: "مَاٰبِ" یہ "اٰبَ يَؤُوْبُ" (ن، اجوف واوی) سے مصدر میمی ہے، اصل "مَاٰبِیْ" تھا، یعنی میرا لوٹنا، "یاء" حذف کرکے کسرہ اس پر دلالت کے لیے باقی رکھا ہے۔"(۲۵)

نیز ترجمہ میں حصر یعنی لفظ 'ہی' کا اضافہ اس لیے کیا کہ خبر مقدم اور مبتدا مؤخر ہے۔ اسی طرح زوائد کی مزید تفصیل لفظ 'طاغوت' اور حذف کی الفاظ 'وعیدی، عقابی' پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ھ۔ مصدری معنٰی کی وضاحت

قرآنِ مجید میں مذکور مصادر کی معانی میں عام طور پر مختلف تراجم میں معنوی اختلاف سامنے آتا ہے۔ ایک ہی لفظ کو بعض مترجم مصدر، بعض اسمِ ظرف سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات مصدر اسم فاعل کے معنٰی کو متضمن ہوتا ہے، یا پھر صفتِ مشبہ یا مبالغہ کے طور پر۔ ان وجوہات کی بناء پر معنٰی میں سقم آجاتا ہے۔ موصوف نے اس قبیل کے الفاظ و مصادر کی توجیہات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اِن کا درست محل و معنٰی بھی کیا ہے۔ اس کی امثلہ درج ذیل ہیں؛

۱۔ سورہ الفاتحہ میں آیتِ کریمہ " رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ " کے لفظِ ربّ کے ترجمہ میں بہت زیادہ اختلاف اور توجیہات ہیں۔ اس میں انہوں نے ترجمہ ایسی توجیہ کی ہے کہ اختلاف رہتا ہی نہیں اور تمام اقوال میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا ترجمہ مبالغہ کے معنٰی کو ملحوظ رکھتے ہوئے 'پیدائش سے کمال تک پہنچانے والا' کیا ہے۔ جبکہ تفسیر میں فرماتے ہیں:

"رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: رَبِّ کا معنی ہے سردار جس کی اطاعت ہوتی ہو اور مالک اور پرورش کرنے والا۔ یہ " رَبَّ يَرُبُّ (ن) پرورش کرنا(میں سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے، یا مصدر ہے جو مبالغہ کے لیے اسم فاعل کی جگہ استعمال ہوا ہے، جیسے " زَيْدٌ عَدْلٌ" "زَيْدٌ عَادِلٌ " کی جگہ استعمال

ہوتا ہے، یعنی زید اتنا عادل ہے کہ اس کا وجود ہی عدل ہے۔) اللہ تعالیٰ میں یہ تینوں صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں، اس سے بڑا سید کوئی نہیں، وہی سب کا مالک ہے اور ہر ایک کو پیدائش سے کمال تک پہنچانے والا اور اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا بھی وہی ہے، گویا وہ ذات پاک سراپا پرورش ہے۔"[۲۶]

۲۔ آیتِ کریمہ 'یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ" میں لفظِ المحیض کی بابت لکھتے ہیں:

"حَاضَ یَحِیْضُ (ض) سے اسم مصدر ہے، اس کا اصل معنی "بہنا" ہے۔ مراد عورت کا وہ خون ہے جو ہر ماہ عادت کے مطابق آتا ہے۔ عادت کے خلاف جو خون آئے وہ استحاضہ (بیماری) ہے۔"[۲۷]

۳۔ آیتِ کریمہ ' قال معاذ اللہ' میں لفظ معاذ کو مصدرِ میمی قرار دیتے ہوئے اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مَعَاذَ" مصدر میمی ہے، معنی ہے: "أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مَعَاذًا مِمَّا تُرِیْدِیْنَ" یعنی تم جو چاہتی ہو میں اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے کر اس سے بچالے۔[۲۸]

و۔ صیغوں کے ابواب اور ان اثرات کی تفصیل

دورانِ ترجمہ مولانا موصوف مختلف الفاظ اور صیغوں کے ابواب اور ان کی بناوٹ میں جو اصول کار فرما ہوتے ہیں ان کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ترجمہ کرتے ہیں اور تفسیر قرآن میں ان کے اثرات کو بھی واضح کرتے ہیں بلکہ ان کی توجیہات کا بھی ذکر فرما دیتے ہیں۔ اس کی امثلہ درج ذیل ہیں:

ا۔ آیتِ کریمہ ' فَإِذَا تَطَهَّرْنَ ' میں تطھرن کا ترجمہ ' خوب پاک ہو جائیں' کیا اور ' حَتّٰی یَطْهُرْنَ ' کے بارے لکھتے ہیں:

"حَتّٰی یَطْهُرْنَ: یہ باب "نَصَرَ" اور "کَرُمَ" سے ہے، بمعنی پاک ہو جائیں "تَطَهَّرْنَ" باب تفعل ہے، جس میں مبالغہ ہے، یعنی "خوب پاک ہو جائیں" غسل کر لیں۔ "حَتّٰی یَطْهُرْنَ" سے معلوم ہوا کہ حیض سے پاک ہونے تک جماع منع ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے جماع کی اجازت "تَطَهَّرْنَ" (یعنی غسل کرنے) کے بعد دی ہے۔"[۲۹]

۲۔ اسی طرح آیتِ کریمہ ' لَا تُضَآرَّ' کا ترجمہ ' نہ تکلیف دی جائے' کیا ہے تاہم تفسیر دو طرح کی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لَا تُضَآرَّ: یہ "ضَرَرَ" سے باب مفاعلہ کا واحد مؤنث نہی حاضر مجہول کا صیغہ ہے، ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ نہی حاضر معلوم بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ (رض) لکھتے ہیں: "ماں کو تکلیف دینا یہ ہے کہ وہ مثلاً اپنے بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہے مگر باپ زبردستی چھین لے، یا یہ کہ اسے دودھ پلانے پر مجبور

کرے اور خرچہ نہ دے اور باپ کو تکلیف دینا یہ ہے کہ ماں بچے کا سارا بوجھ اس پر ڈال دے، یا دودھ پلانے سے انکار کر دے، یا بھاری اخراجات کا مطالبہ کرے جو باپ کی وسعت سے باہر ہوں۔ " آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: "نہ ماں بچے کی وجہ سے ضرر پہنچا کر باپ کو تکلیف دے اور نہ باپ بچے کی وجہ سے ماں کو ضرر پہنچائے۔ " پہلی صورت میں " لَا تُضَآرَّ " صیغہ فعل مجہول کا ہو گا۔ دوسرے ترجمہ کے اعتبار سے صیغہ معروف، نتیجہ ایک ہی ہے۔ "(۳۰)

۳۔ آیتِ کریمہ 'وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ' میں الْمُعَذِّرُوْنَ کا ترجمہ ' جھوٹے بہانے بنانے والے' کیا ہے۔ جبکہ اکثر مترجمین نے محض 'بہانے بنانے والے' کیا ہے۔ اس کی وجہ بایں الفاظ لکھتے ہیں:

"بعض مفسرین نے "الْمُعَذِّرُوْنَ " سے مراد جھوٹے بہانے اور باطل عذر پیش کرنے والے لیے ہیں۔ زمخشری (رض) نے اس رائے کی تائید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "الْمُعَذِّرُوْنَ " باب تفعیل سے ہو تو " عَذَّرَ فِي الْأَمْرِ " کا معنی ہی یہ ہے کہ اس نے کام میں سستی کی، اس کی کوشش ہی نہیں کی اور ظاہر یہ کیا کہ اس کا عذر تھا، حالانکہ اس کا عذر کوئی نہ تھا اور اگر "الْمُعَذِّرُوْنَ " باب افتعال سے ہو اور اس کا اصل "مُعْتَذِرُوْنَ " ہو پھر بھی جھوٹے بہانے ہی مراد ہیں، جیسا کہ آگے صاف آ رہا ہے: (يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ)[التوبۃ:۹۴] "تمہارے سامنے عذر پیش کریں گے، جب تم ان کی طرف واپس آؤ گے۔" (۳۱)

موصوف کے اختیار کردہ ترجمہ کی روشنی میں مندرجہ بالا دو تفسیریں سامنے آتی ہیں جیسا کہ انہوں نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے پہلی تفسیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ہر عذر والا جھوٹا نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اگلی آیت میں کئی عذر والوں کو گناہ سے بری قرار دیا ہے اور اس آیت میں بھی دونوں قسموں میں سے " الَّذِيْنَ كَفَرُوْا " ہی کو عذاب کی وعید سنائی ہے، اگرچہ ترجمے کا رجحان دوسری تفسیر کی طرف ہے، یہ حافظ امام ابن کثیر (رض) کا موقف ہے جس میں وزن معلوم ہوتا ہے۔ (ایضاً)

الفاظ کے صلات کا بیان

یہ عربی زبان کا مسلّم اصول اور قاعدہ ہے کہ افعال کا اگر صلہ (وہ حرف جس کے ساتھ فعل کے متعلقات جڑے ہوں اور وہ فعل ان متعلقات کے مطابق معنی دے، اگر وہ) بدل دیا جائے تو معنی میں تبدیلی لازم آتی ہے۔ دورانِ ترجمہ موصوف نے اس امر کا بھرپور خیال رکھا ہے اور ترجمہ کرتے ہوئے صلہ کی تبدیلی کا اثر خوب ظاہر کیا ہے۔ اس کی امثلہ درج ذیل ہیں:

۱۔ آیتِ کریمہ 'ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم " میں لفظِ یرغب کا ترجمہ ' اور جو ابراہیم کے دین سے بے

رغبتی کرے' کیا ہے۔ اس کی تعجیہ یوں بیان کرتے ہیں:

"رَغِبَ یَرْغَبُ" کے بعد اگر "فی" آئے تو اس کا معنی کسی چیز میں رغبت رکھنا اور اگر "عن" آئے تو اس کا معنی بے رغبتی ہوتا ہے۔"(۳۲)

۲۔ 'اسْتَوٰٓی' کا ترجمہ الٰی کے صلہ کی وجہ سے"پھر آسمان کی طرف متوجہ ہو' کیا ہے۔ معنی کے اس تفاوت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابن کثیر نے فرمایا: یہاں" اسْتَوٰٓی "کے ضمن میں ارادہ کرنے اور متوجہ ہونے کا معنی رکھا گیا ہے، کیونکہ اسے " اِلَی " کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔"(۳۳)

۳۔ آیتِ کریمہ ' وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْـرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا' میں لفظِ 'ارکبوا' کا معنی ' اس میں سوار ہو جاؤ' کیا ہے۔ اس کی وضاحت بایں الفاظ کرتے ہیں:

"ارْكَبُوْا فِيْهَا" عام طور پر سوار ہونے کے لیے "رَكِبَ عَلَيْهِ" آتا ہے، یہاں "ارْكَبُوْا عَلَيْهَا" کی جگہ "ارْكَبُوْا فِيْهَا" اس لیے فرمایا کہ کشتی میں کمرے کی طرح داخل ہو کر بیٹھا جاتا ہے، جب کہ گھوڑے وغیرہ کے اوپر سوار ہوتے ہیں۔"(۳۴)

۲۔ مبحث دوم: ترجمہ قرآن کے نحوی لحاظ سے خصائص

الف۔ حروفِ عاملہ زائدہ کا ترجمہ اور اس کی توجیہات

عربی زبان میں کئی حروفِ عاملہ ایسے ہیں جن کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ زائد ہیں اور ان کا کلام میں کوئی اثر نہیں۔ حالانکہ جمہور مفسرین کے یہاں یہ نظریہ غلط ہے۔ برصغیر میں اکثر تراجمِ قرآنی کا مطالعہ کیا جائے تو ان حروفِ زائدہ خاص طور پر مِن اور باء حروفِ جارہ کا سرے سے کوئی معنٰی ہی نہیں کیا جاتا حالانکہ یہ حروف عاملہ (مابعد کو زیر دیتے) ہیں۔ چنانچہ فاضل مترجم نے اس امر کا حد درجہ خیال رکھا ہے کہ کوئی حرف زائد قرار پائے اور اس کا ترجمہ نا ہو سکے بلکہ انہوں نے ہر حرف کا مقصد اور تفسیری اثر واضح کیا ہے۔ مثال کے طور پر حرفِ جر 'مِن' کے بارے لکھتے ہیں:

" لفظِ مِن بھی کئی معانی میں مستعمل کے لیے ہوتا ہے مثلاً بیان کے لیے، بعض کا معنٰی دینے کے لیے، تاکید کے معنٰی کے لیے، تعلیل وغیرہ کے لیے" (۳۵)

یہ اور اس قبیل کے دیگر الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے موصوف نے بہت محنت سے کام کیا ہے۔ ان کی امثلہ درج ذیل ہیں:

ا۔ مِن حرفِ جر

الف۔ آیتِ کریمہ ' وابتغوا من فضل اللہ ' کا ترجمہ ' اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو' کیا ہے۔(۳۶)

ب۔ آیتِ کریمہ 'کُلَّمَآ أَرَادُوا أَنۡ یَخۡرُجُوا مِنۡهَا مِنۡ غَمٍّ' میں لفظ غم کا ترجمہ 'سخت گھٹن' کیا ہے۔ (۳۷)

۲۔ باء حرفِ جر

الف۔ آیتِ کریمہ "وَمَا هُم بِخَٰرِجِینَ مِنَ النَّارِ" میں باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ 'وہ کسی صورت آگ سے نکلنے والے نہیں' کیا ہے۔ (۳۸)

ب۔ آیتِ کریمہ 'وما أنت بمُسمِعٍ مَن في القبور' میں بمُسمِعٍ کے لحاظ سے ترجمہ 'اور تو ہرگز اسے سنانے والا نہیں جو قبروں میں ہے' کیا ہے۔ (۳۹)

اسی طرح اگر مذکورہ بالا کے سوا کوئی اور حروفِ عاملہ کلام میں موجود ہوں لیکن اشتباہ لاحق ہو رہا ہو تو ترجمہ ایسا کرتے ہیں کہ وہ اشتباہ ختم ہو جاتا ہے اور اسی پھر تفسیر میں خود ان کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'أَلَّا تَتَّخِذُوا مِنۡ دُونِي وَکِیلًا' میں 'الّا تتخذوا' کا ترجمہ 'اور یہ کہ نا تم بناؤ' کیا ہے جس میں لفظِ 'یہ کہ' ان کا ترجمہ ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> أَلَّا تَتَّخِذُوا مِنۡ دُونِي وَکِیلًا: "أَلَّا تَتَّخِذُوا" اصل میں "أَنۡ لَا تَتَّخِذُوا" ہے۔ یہاں "أَنۡ" کو مصدریہ مان کر اس سے پہلے لام محذوف مانیں گے، یعنی "لِئَلَّا تَتَّخِذُوا" (تاکہ تم۔۔) یا "أَنۡ" بمعنی "أَيۡ" (تفسیریہ) ہے۔"(۴۰)

۳۔ أن زائدہ کا ترجمہ

اَن زائدہ کا ترجمہ کسی مترجم نے نہیں کیا بلکہ اس کو مہمل سمجھ کا صرفِ نظر کیا ہے۔ راقم نے گیارہ تراجم کو دیکھا ہے کسی میں بھی اس کا ترجمہ ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ دراصل ان زائدہ کا ترجمہ کرنے کی بابت اصول یہ ہے کہ اگر ایک ہی جملہ دوبار آئے اور ان میں سے دوسرے میں اس کو ذکر کیا گیا ہو تو مقصود معنیٰ کی تاکید اور تیقّن ہوتی ہے۔ موصوف کے ترجمہ میں اس کا خاص اہتمام کیا ہے۔ اس کی مثالیں درج ذیل ہے:

۱۔ سورہ ھود کی آیتِ کریمہ 'ولمّا جَاءَت رُسُلنا لوطاً' کا ترجمہ 'اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے' کیا ہے (۴۱) اور 'ولمّا أَن جَاءَت رُسُلنا لوطاً' کا ترجمہ 'اور جیسے ہی ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے' کیا ہے۔ (۴۲)

۲۔ اسی طرح سورہ یوسف کی آیتِ کریمہ 'فلما ان جاء البشیر' کا ترجمہ بھی مترجم نے اسی تیقّن کے معنیٰ کو شامل کرتے ہوئے 'پھر جیسے ہی خوشخبری دینے والا آیا' کیا ہے۔ (۴۳)

۴۔ إذا ما کا ترجمہ

عربی میں اذا (جب، جس وقت) ظرفیت کا معنیٰ دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں زمان کا معنیٰ ہوتا ہے جو فعل کو کسی وقت کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ لیکن بسا اوقات اس کے ساتھ لفظِ 'ما' کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اکثر مفسرین

و مترجمین نے اس کو زائد قرار دے کر کوئی معنیٰ نہیں کیا۔ تاہم مفسرین میں سے امام زمخشری اور انہی سے استفادہ کرتے ہوئے مترجم (عبد السلام بن محمد) نے اس کا ترجمہ تاکید کے طور پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ ' أَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ آمَنتُم بِهِ ' کا ترجمہ تاکیدی معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ' کیا پھر جونہی وہ (عذاب) آپڑے گا تو اس پر ایمان لے آؤ گے؟ ' کیا ہے۔[44]

ب۔ صیغہ جمع و تثنیہ کی وضاحت

معنیٰ کی درست تعیین میں الفاظ کی وضع کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ جو لفظ واحد ہے اس میں اکائی، تثنیہ میں دو، اور جمع میں دو سے زائد کا معنیٰ عربوں کے یہاں لفظ کی وضع میں ملحوظ ہوتا ہے۔ بسا اوقات لفظ ظاہری طور پر لفظ واحد معلوم ہو رہا ہوتا ہے لیکن اس کا معنیٰ جمع کا ہوتا ہے۔ اس قبیل کے الفاظ کو اسم جمع کہتے ہیں۔ تاہم جمع حقیقی یا تثنیہ ہو تو اور ان کی توضیح بھی ہو جائے تو ترجمہ میں درستی ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر سورہ یوسف میں ' يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ' کا ترجمہ اکثر مفسرین و مترجمین نے ' اے میرے جیل کے ساتھیو ' کیا ہے جو غلط ہے۔ جبکہ ہمارے پیشِ نظر مترجم نے اس کا ترجمہ ' اے قید خانے کے دو ساتھیو! ' کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

> ''يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ : ''صَاحِبَيِ'' اصل میں ''صَاحِبَيْنِ'' تھا جو ''صَاحِبٌ'' (ساتھی) کی تثنیہ ہے۔ ''السِّجْنِ'' کی طرف مضاف کیا تو نون تثنیہ گر گیا اور یاء کو کسرہ دے کر آگے ملا دیا گیا، یہ یاء متکلم کی نہیں، اس لیے معنی ہے ''اے قید خانے کے دو ساتھیو!''[45]

اسی طرح لفظِ 'غُزًّى' کا ترجمہ واحد 'لڑائی کرنے والا' کیا جاتا ہے جبکہ یہ لفظ جمع کا ہے۔ اس کی توضیح و ترجمہ مترجم (مولانا موصوف) نے یوں کیا ہے:

> ''یہ ''غَازٍ'' کی جمع ہے، جو ''غَزَا يَغْزُ'' سے اسم فاعل ہے، بمعنی لڑنے والے، جیسے ''رَاكِعٌ'' کی جمع ''رُكَّعٌ'' آتی ہے۔[46]

تثنیہ کی ایک اور مثال جس میں اکثر اوقات تفسیری اختلاف بھی دیکھنے کو ملتا ہے، لفظِ ' وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا ' ہے۔ اس کا ترجمہ و تفسیر کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

> ''(اس) سے مراد زنا کرنے والے مرد عورت ہیں۔ علاوہ ازیں ''يَأْتِيٰنِهَا '' میں ''ہا'' کی ضمیر پچھلی آیت میں مذکور الفاحشہ کی طرف جا رہی ہے جس سے اس مقام پر مراد زنا ہے۔ اس فاحشہ سے مراد قوم لوط کا عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا ''اللذان'' تثنیہ مذکر کا لفظ تو دو افراد اگر مذکر و مؤنث ہوں تو ان کے لیے تثنیہ مذکر کی ضمیر عام استعمال ہوتی ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔''[47]

ج۔ حصری و تاکیدی الفاظ و حروفِ غیر زائدہ کا ترجمہ

اس نوع میں وہ الفاظ شامل ہیں جو اصلاً تاکید کے لیے یا کسی دوسری خاص غرض کے لیے لائے جاتے ہیں تاہم اکثر مترجمین نے ان سے اغماض برتا ہو۔

اولاً مفعول مطلق: جیسا کہ قاعدہ معلوم ہے کہ اگر مذکورہ (سابقہ) فعل سے مصدر ذکر کیا جائے تو وہ مفعول مطلق ہوتا ہے اور تاکید کے معنیٰ کو متضمن ہوتا ہے۔ اکثر مترجمین اس کا لفظی ترجمہ تو کر دیتے ہیں تاہم اس میں تاکیدی معنیٰ کو ملحوظ ہی نہیں رکھتے یا بامحاورہ ترجمہ مشکل ہونے کی وجہ سے ترک کر دیتے ہیں جس سے کلام کا حسن خراب ہو جاتا ہے اور مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'وكلّ شيئ فصّلناه تفصيلاً' کا ترجمہ اکثر نے 'اور ہم نے ہر چیز کو کھول کر بیان کیا ہے، بیان کرنا' کیا ہے۔ حالانکہ یہ ترجمہ بالکل غلط اور ناموزوں ہے۔ موصوف نے اس کا ترجمہ 'اور ہر چیز، ہم نے اسے کھول کر بیان کر دیا ہے، خوب کھول کر بیان کرنا' کیا ہے جو ہر اعتبار سے بہترین اور کلام کے عین مطابق ہے۔[۴۸]

ثانیاً الف لام: جو تعریف، تخصیص، استغراق، بیانِ جنس اور عہد کے معنیٰ کو متضمن ہوتا ہے اس کے مطابق ترجمہ کرنا، برصغیر کے عمومی تراجم قرآنیہ میں اس رجحان کا فقدان ہے، ماسوائے ان جگہوں کے جو معروف ہیں، لیکن وہاں بھی بین القوسین تشریحی انداز میں الفاظ لکھ دی جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'فَعَصٰى فِرعَونُ الرَّسُولَ' کا ترجمہ 'پس فرعون نے رسول (موسیٰؑ) کی نافرمانی کی' کیا گیا ہے۔ تاہم موصوف نے اس کا ترجمہ 'سو فرعون نے اُس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی' کیا ہے۔[۴۹]

اس کی دوسری مثال جس میں الف لام استغراق کی معنیٰ دیتا ہے، آیتِ کریمہ 'الحمد للہ رب العٰلمین' ہے جس میں الحمد کا ترجمہ موصوف نے 'سب تعریف' کیا ہے۔[۵۰]

تیسری مثال جس میں الف لام عہد ذہنی (یعنی ذہن میں ایک فرد یا شخص غیر متعین ہو) کا داخل تھا اور اس کا ترجمہ کرتے ہوئے اسے ملحوظ رکھا گیا ہے، آیتِ کریمہ 'وأخاف أن يأكله الذئب' ہے جس کا ترجمہ تقریباً سبھی مترجمین نے 'بھیڑیا' کیا ہے جبکہ عبد السلام بن محمد نے اس کا ترجمہ 'کوئی بھیڑیا' کیا ہے۔[۵۱] جب کہ عہدِ خارجی (خارج یعنی ذہن میں ایک فرد یا شئے متعین ہو) کی مثال آیتِ کریمہ 'وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ' میں لفظِ العباد کا ترجمہ 'ان بندوں' کیا ہے۔[۵۲] دوسری مثال آیتِ کریمہ 'وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْأَرْضِ' میں لفظ الارض ہے جس کا ترجمہ فاضل مترجم نے 'اُس زمین' کیا ہے اور تفسیر میں وضاحت کی:

''اَلْاَرْضَ '' میں الف لام عہد کا ہے، مراد ارض مکہ ہے''[۵۳]

ثالثاً حصر کا مفہوم: عام طور پر الفاظ کی تقدیم و تاخیر یا زیادتی سے حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خبر اپنے مبتدا سے مقدم ہو، یا خبر پر الف لام داخل ہو جو حصر کا تقاضا کرے۔ اِس ترجمہ میں انہوں نے یہ سب امور پیشِ نظر رکھے

ہیں۔ امثلہ درج ذیل ہیں:

اول الذکر کی مثال: آیتِ کریمہ 'وَاِلَيْهِ مَاٰبِ' کا ترجمہ ' اور اس کی طرف ہی میرا لوٹنا ہے' کیا ہے جس میں حصر یعنی لفظِ 'ہی' کا اضافہ اس لیے کیا کہ خبر مقدم اور مبتدا موٴخر ہے۔ (۵۴)

ثانی الذکر کی مثال: آیتِ کریمہ 'وھو العزیز الغفور' کا ترجمہ ' اور وہی سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے' کیا ہے اس لیے کہ مبتدا کی دونوں خبروں پر الف لام ہے۔ (۵۵)

رابعاً تخصیص کا معنی: بھی الفاظ کی تقدیم و تاخیر یا اضافے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ مفعول بہ کا مقدم آنا بھی ہے۔ مفعول کے مقدم آنے سے معنی میں حصر پیدا ہوتا ہے اس کی مثال آیتِ کریمہ ' ایّاک نعبد وایّاک نستعین' ہے۔ اس کا ترجمہ فاضل مترجم نے ' ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں' کیا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس میں بھی " اِيَّاكَ " پہلے آنے کی وجہ سے حصر ہے، یعنی ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، کسی دوسرے سے نہیں۔ یہاں سے بندے کی درخواست شروع ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق قبول ہو چکی۔" (۵۶)

د۔ کان وماکان کا ترجمہ

تقریباً ۹۰ فیصد مترجمین نے لفظِ کان کا ترجمہ 'تھا یا ہے' صیغہ ماضی کے طور پر کیا ہے۔ کسی نے بھی اس امر کا خیال نہیں رکھا کہ کان کا ذکر کلام اللہ میں ایک خاص معنویت اور سیاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی لیے برصغیر کے ہر کس وناکس کی زبان پر کان کا ترجمہ 'ہے یا تھا' مشہور ہے۔ حالانکہ یہ لفظ مختلف معانی کو متضمن ہوتا ہے۔ اس کے ان معانی کو درج ذیل امثلہ سے اجاگر کیا جاتا ہے جو مولانا عبد السلام بن محمد کے ترجمہ میں موجود ہیں:

کان بمعنیٰ ماضی: آیتِ کریمہ 'وکان اللہ غفوراً رحیماً' کا ترجمہ ' اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے' کیا ہے۔ (۵۷)

کان بمعنیٰ استمرار: آیتِ کریمہ ' وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ' کا ترجمہ ' وہ اس سے قبل بہت زیادہ برائیاں کیا کرتے تھے' کیا ہے۔ اس کی توجیہ یوں بیان کرتے ہیں:

> " فعل مضارع پر "كَانَ " آئے تو استمرار اور ہمیشگی کا معنی دیتا ہے، الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی دلیل ہو۔" (۵۸)

کان بمعنیٰ لَم یَزَل: آیتِ کریمہ 'کیف نکلّم من کان فی المھد صبیاً' کا ترجمہ ' ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے' کیا ہے۔ (۵۹) اس ترجمہ سے کان کی معنویت کا بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے کہ مخاطبین کو یہ بات سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ عیسیٰؑ اس وقت بچے تھے۔

کان بمعنیٰ لَایَنۡبَغِی: آیتِ کریمہ 'وما کان لمومن ولا مومنة' کا ترجمہ 'اور کبھی نا کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا' کیا ہے۔ (۶۰) اس ترجمہ میں لفظِ کبھی سے کان کی زمانی اور لفظِ حق سے لفظی ترجمہ واضح ہو گیا ہے۔

کان کے ساتھ حرفِ نفی کا ترجمہ: اس حوالے سے مترجم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ 'کان کے ساتھ نفی کا ترجمہ شاید ہی کسی مترجم نے کیا ہو'۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے۔ اس لیے کہ راقم کے پیشِ نظر تراجم قرآن میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں کان کے ساتھ حرفِ نفی کی موجودگی کا وہ ترجمہ کیا ہو جا خالصتاً اصولی بنیادوں پر فاضل مترجم نے کیا ہے۔ اس کی مثال آیتِ کریمہ ' وما کان عطاء ربک محظوراً ' کا ترجمہ 'اور تیری رب کی بخشش کبھی بھی بند کی ہوئے نہیں' کیا ہے جو کہ زمانی و لفظی ہر دو اعتبار سے درست اور اصولی ہے۔ (۶۱)

ھ۔ تنوین کی انواع اور ان کے معنوی اثرات

قرآن مجید میں جو الفاظ نکرہ استعمال ہوئے ہیں ان پر آنے والی تنوین کی کئی اقسام ہیں۔ اور انہی اقسام کے تحت الفاظ کا ترجمہ کیا جائے تو ان کی تفسیر و تشریح بہتر سمجھ آتی ہے۔ مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے تنوین کی جملہ اقسام کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اور ان کے تحت ہی تفسیر میں توضیحات پیش کی ہیں۔ تنوین کی ان اقسام میں تنوینِ تقلیل، تحقیر، تعظیم اور تنکیر شامل ہیں۔ ان سب کی امثلہ درج ذیل ہیں:

۱۔ تنوینِ تحقیر: آیتِ کریمہ ' جُنۡدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهۡزُوۡمٌ مِّنَ الۡاَحۡزَابِ' میں 'جُنۡدٌ' پر تنوین تقلیل و تحقیر کے لیے ہے اس لیے ترجمہ 'ایک حقیر سا لشکر' کیا ہے۔ (۶۲)

۲۔ تنوینِ تعظیم: آیتِ کریمہ 'فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ' میں 'بِحَرۡبٍ' پر تنوینِ تعظیم ہے، اس لیے ترجمہ 'بڑی جنگ' کیا ہے۔ (۶۳)

۳۔ تنوینِ تقلیل: آیتِ کریمہ 'كَمَثَلِ صَفۡوَانٍ علیه تراب' میں 'تُرَابٌ' پر تنوین تقلیل کی ہے اس لیے ترجمہ 'تھوڑی سی مٹی جمی ہوئی' کیا ہے (تاکہ دیکھنے والا اسے قابل کاشت زمین خیال کرے)۔ (۶۴)

۴۔ تنوین تنکیر: آیتِ کریمہ 'مَتَاعٌ' میں لفظِ متاع کا ترجمہ 'کچھ (زندگی کا) سامان' کیا ہے کیونکہ تنوین تنکیر سے معلوم ہوا۔ (۶۵)

۳۔ مبحث سوم؛ ترجمہ قرآن کی لفظی معنویت اور اثرات

ا۔ صیغے کے مطابق ترجمہ

مترجم (عبد السلام بن محمد) نے صیغے کے مطابق ممکنہ تمام معانی اور حقیقی و آسان اردو ترجمہ کی حتی الوسع کوشش کی ہے اور یہ کوشش بلا مبالغہ ان کے ترجمہ سے چھلکتی ہے۔ اس بات کا مفصل تذکرہ ابواب کی خاصیات اور زوائدِ

حروف کی بحث میں ہو چکا ہے کہ حرف یا لفظ کی زیادتی معنٰی کی زیادتی کو لازم ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جہاں بھی اس اصول کو پایا وہاں اس کا اطلاق کرتے ہوئے لفظ کا قریب تریں ترجمہ کیا ہے۔ اور تفسیر میں اس امر کی وضاحت بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر 'یَسْتَفْتِحُوْنَ' کا ترجمہ 'فتح و نصرت طلب کرتے تھے' کیا ہے۔ جبکہ تفسیر اس کا ایک اور ترجمہ بھی کیا ہے جس کے متعلق لکھتے ہیں:

"یعنی نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے جب یہودی عرب کے مشرکین سے مغلوب ہوتے تو وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ ! نبی آخر الزمان جلد ظاہر ہوں، تاکہ ہم ان کے ساتھ مل کر ان کافروں پر غلبہ حاصل کریں۔ (طبری) "یَسْتَفْتِحُوْنَ" کا دوسرا معنی ہے" : یَفْتَحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' فَتَحَ عَلَیْهِ (کا معنی ہے خبر دینا اور سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہے، یعنی کافروں کو خوب کھول کر بتاتے تھے۔)" (۶۶)

اسی طرح کسی بھی لفظ کے ممکنہ تمام تراجم کو مدِ نظر رکھتے ہیں تاہم ترجمہ میں اس کا اقرب اللفظ ہی ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَیْنِ أحصٰی' میں 'احصیٰ' کا ترجمہ 'زیادہ یاد رکھنے والا' کیا ہے۔ تفسیر میں اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"یہ ترجمہ اس وقت ہے جب "اَحْصٰی" کو اسم تفضیل مانیں اور یہ معنی راجح ہے، کیونکہ باب افعال سے بھی "أَفْعَلُ" کے وزن پر اسم تفضیل آجاتا ہے۔ دوسرا معنی اس صورت میں ہے کہ "اَحْصٰی" کو ماضی معروف قرار دیں، اس وقت معنی یہ ہو گا کہ دونوں گروہوں میں سے کون ہے جس نے اس مدت کو یاد رکھا ہے جو وہ ٹھہرے ہیں۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کو گزشتہ، موجودہ اور آئندہ ہر چیز کا علم ہے کہ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو گا، مگر ظاہر ہے کہ یہ علم کہ فلاں کام واقع ہو چکا ہے، اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ کام واقع ہو جائے، یعنی تاکہ ہم اپنے علم کے مطابق اس کا واقع ہونا جان لیں۔" (۶۷)

اسی طرح اگر ایک لفظ کا استعمال کئی معانی میں ایک ہی وضع کی وجہ سے ہو تو اس میں بھی اقرب الی اللفظ معنٰی ترجمہ میں سمو دیتے ہیں اور بقیہ کا تذکرہ تفسیر میں کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ' میں لفظِ 'مَسْجِدٍ' کی وضاحت بایں الفاظ کرتے ہیں:

"(یہ) مصدر میمی، ظرف زمان اور ظرف مکان تینوں مراد ہو سکتے ہیں۔ مصدر میمی ہو تو اس کا معنی سجدہ بھی ہے اور نماز بھی، جیسے "رَكْعَة" کا معنی رکوع بھی ہے اور نماز میں قیام، رکوع، قومہ، سجدہ اور قراءت وغیرہ کے مجموعہ کو بھی "رَكْعَة" کہا جاتا ہے اور سجدہ بھی اور قیام بھی۔ یعنی جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے، تو معنی ہو گا ہر نماز میں۔ اگر مراد زمان ہو تو ہر سجدے یا نماز کے وقت اور مکان ہو تو ہر سجدے یا نماز کی جگہ اپنے رخ سیدھے کر لو، یعنی قبلہ کی طرف، یا جیسے اللہ کے رسول نے حکم دیا ہے اس طرح اپنے چہروں، یعنی

اپنے آپ کو سیدھا کر لو اور ان کے بتائے ہوئے طریقے پر نماز پڑھو۔ (۶۸)

لفظ کے حقیقی معنی کو متعین کر کے ترجمہ میں راجح ہی شامل کرتے ہیں، جبکہ اس میں اختلافی معنیٰ کو تفسیر میں جگہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّه لِلْجَبِيْنِ ' میں جبین کا معنیٰ 'کنپٹی یا ماتھے کی جانب' کیا ہے۔ اس کو مرجوح قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"عام طور پر مفسرین نے " اَلْجَبِيْنُ " کا ترجمہ پیشانی یا ماتھا کیا ہے......اس مقام پر جبین سے مراد ماتھا لینا بہت بعید ہے، کیونکہ جبین کا معنی " جَبْهَةٌ 'ماتھے کی ایک جانب ہے۔ ہر آدمی کی دو جبینیں ہوتی ہیں۔ طبری نے اس قسم کی روایتیں نقل کرنے کے باوجود خود " وَتَلَّه لِلْجَبِيْنِ " کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے : وَصَرَعَهٗ لِلْجَبِيْنِ وَالْجَبِيْنَانِ مَا عَنْ يَمِيْنِ الْجَبْهَةِ وَعَنْ شِمَالِهَا وَلِلْوَجْهِ جَبِيْنَانِ وَالْجَبْهَةُ بَيْنَهُمَا " یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اسے جبین پر گرا لیا اور دو جبینیں وہ ہیں جو " جَبْهَةٌ " پیشانی کے دائیں اور بائیں طرف ہوتی ہیں اور چہرے کی دو جبینیں ہوتی ہیں اور " جَبْهَةٌ " پیشانی ان دونوں کے درمیان ہوتی ہے۔ (۶۹)

اسی طرح آیاتِ قرآنیہ میں وارد مختلف اور مشکل الفاظ کی معنوی تعیین بھی کرتے ہیں۔ اور ان کے مترادفات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ ' وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ ' کی درج ذیل وضاحت کرتے ہیں:

"النَّخِيْلِ " اور "اَلنَّخْلُ " اسم جنس ہیں، کھجور کا درخت۔ اگر ایک درخت واضح کرنا ہو تو " تاء " لگا دیتے ہیں، "نَخِيْلَةٌ " اور "نَخْلَةٌ"۔ "نَخَلَ يَنْخُلُ " کا معنی ہے چھان کر عمدہ حصہ الگ کرنا، چھاننا۔ اس لیے بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ چونکہ کھجور پھلوں میں منتخب ترین پھل ہے، اس لیے اسے "نَخِيْلٌ " کہتے ہیں۔ اس کے پھل کے مختلف وقتوں کے لحاظ سے الگ الگ نام ہیں، "اَلْبَلَحُ " پھر "اَلْبُسْرُ " پھر " اَلرُّطَبُ " پھر "اَلتَّمْرُ "۔ اس لیے اس کے درخت کا نام لیا اور انگور کے پھل کا نام جمع کے ساتھ "وَالْاَعْنَابِ " لیا، کیونکہ انگور کی بیشمار قسمیں ہیں، البتہ اس کی بیل کو عربی میں "اَلْكَرْمُ " کہتے ہیں۔ "سَكَرًا " نشہ آور چیز، یہ سَكَرٌ " اور "سُكْرٌ " دونوں طرح پڑھا جاتا ہے، جیسے "رَشَدٌ " اور "رُشْدٌ۔ (۷۰)

لفظ کے معنیٰ کو مزید بہتر بنانے کے لیے دورانِ ترجمہ مترجم (عبد السلام بن محمد) نے دو مزید امور کا بھی خیال رکھا ہے۔ اولاً ترجمہ میں آسان اردو الفاظ کا استعمال کیا ہے اور دوم انہوں نے فعلِ امر پر داخل ہونے والے لامِ امر کا ترجمہ ' چاہیے کہ ' کی بجائے لازمی اور طلب والے الفاظ سے ادا کیا ہے۔

اول الذکر نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ترجمہ زیادہ سے زیادہ آسان اردو میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، فارسی یا عربی الفاظ میں ترجمہ سے مطلب ادا ہو بھی جائے تو عام آدمی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، مثلاً بعض اردو ترجمہ کرنے والوں نے 'مرسلون' کا ترجمہ 'فرستادگانِ الٰہی' 'کذّاب اَشِر' کا ترجمہ برخود غلط 'الحمید' کا ترجمہ 'ستودہ' اور 'ریب المنون' کا ترجمہ حوادثِ دہر کیا ہے، اس لیے احتراز کیا گیا ہے۔" (۷۱)

چنانچہ انہوں نے خود 'کذابٌ اَشِر' کا ترجمہ 'بہت جھوٹا، متکبر' 'الحمید' کا ترجمہ 'بے حد تعریف والا' 'ریب المنون کا ترجمہ 'زمانے کے حوادث' کیا ہے۔

جبکہ ثانی الذکر (لام امر کا ترجمہ کرتے ہوئے اس) کے بارے میں فرماتے ہیں:

"عام طور پر امر غائب کا ترجمہ لفظ 'چاہیے' سے شروع کیا جاتا ہے۔ مثلاً 'ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ' اور چاہیے کہ اہلِ انجیل اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ لفظ 'چاہیے' کے بغیر امر کا مفہوم ادا ہو جائے یا پھر چاہیے کے بجائے 'لازم ہے' استعمال کیا جائے۔ چنانچہ اس آیت کا ترجمہ ہو گا' اور لازم ہے کہ انجیل والے اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے'۔" (۷۲)

الغرض مترجم نے از حد محنت اور دقتِ نظری سے کام لیتے ہوئے قرآنِ مجید میں آنے والے ہر لفظ کا ترجمہ اس کے صیغے کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور فعلِ ماضی، مضارع، امر، اسم فاعل، مفعول، صفتِ مشبہ و مبالغہ وغیرہ کا ترجمہ، اسی طرح سیاق وسباق کی رعایت، شرط و جزا کے معنوی تعلق کا عین اصولوں کے مطابق کرنے کی سعی کی ہے اور اس میں کافی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

۵۔ خاتمۃ البحث و نتائج تحقیق

مذکورہ بالا تمام تحقیق کی روشنی میں درج ذیل نتائج بر آمد ہوتے ہیں:

۱۔ ترجمۃ القرآن از مولانا عبد السلام بن محمد کی افادیت اور اس کا اسلوب برصغیر میں کیے گئے دیگر تراجم قرآنی کی نسبت بہت زیادہ مفید اور خصائص و امتیازات کی بناء پر نمایاں ہے۔

۲۔ موصوف نے ترجمہ میں اصولی و لغوی قواعد کا بھرپور خیال رکھا ہے اور ہر لفظ کا معنی اس پر داخل عوامل (الف لام، تنوین، حروفِ تاکید وغیرہ) کو مدِ نظر رکھ کر کیا ہے۔

۳۔ دورانِ ترجمہ الفاظ کو حقیقت سے قریب تر اور آسان و جدید اردو کے معانی و مطالب کا جامہ پہنایا ہے۔ دیگر تراجم کی بہ نسبت اس ترجمہ میں لفظی جدت، معنویت میں خوبصورتی اور لفظ کے accurate معنی کو درج کرنے کی سعی کی ہے۔

۴۔ حروفِ زوائد کے ترجمہ کا اہتمام بھی کیا ہے اور ان کی مقصدیت کے پیشِ نظر ان کو معانی درج کیے ہیں، مثلاً باء حرفِ جارہ، مفعول مطلق وغیرہ کا معنیٰ تاکید مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا ہے۔ اسی طرح مبالغہ کے صیغوں کے معانی بھی اسی (کثرت کی) معنویت سے کیے ہیں۔

۵۔ دورانِ ترجمہ تشریحی و توضیحی اسلوب کو اختیار کرنے سے مکمل طور پر احتراز کیا ہے اور بلاواسطہ حقیقی معنیٰ پر ہی دھیان مرکوز رکھا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ موصوف کا تفصیلی ترجمہ ملاحظہ ہو: بھٹوی، محمد طیب، تذکرہ و خدمات علماء و شیخ الحدیث بھٹہ محبت، ابوہریرہ اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۶۳

۲۔ عبد السلام بن محمد، حافظ، تفسیر القرآن الکریم، دارالاندلس، لاہور، ۲۰۱۴ء، جلد ۱، ص ۱۵

۳۔ تفسیر القرآن الکریم، جلد ۱، ص ۱۵

۴۔ مختار احمد سلفی، مولانا، مختار النحو، دارالسلام، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۲

۵۔ تفسیر القرآن الکریم، جلد ۱، ص ۱۶

۶۔ جلد ۳، ص ۷

۷۔ جلد ۱، ص ۱۳۹

۸۔ جلد ۳، ص ۸۴۲

۹۔ جلد ۱، ص ۳۲

۱۰۔ فاضل صالح، ڈاکٹر، معانی النحو، دارالفکر، اردن، ۲۰۰۰ء، جلد ۱، ص ۱۱

۱۱۔ تفسیر القرآن الکریم، جلد ۱، ص ۵۴

۱۲۔ جلد ۱، ص ۵۹

۱۳۔ جلد ۱، ص ۴۶۸

۱۴۔ جلد ۱، ص ۵۱

۱۵۔ جلد ۱، ص ۱۲۶)

۱۶۔ جلد ۱، ص ۸۲۰

۱۷۔ جلد ۱، ص ۱۰

۱۸۔ جلد ۱، ص ۳۷۳

۱۹۔ جلد ۴، ص ۹۷۲

۲۰۔ جلد۳، ص۱۴۱۷۔۲۴۲۷

۲۱۔ جلد۱، ص۱۰

۲۲۔ جلد۲، ص۱۵۹

۲۳۔ جلد۱، ص۷۰۹

۲۴۔ جلد۳، ص۲۱۰

۲۵۔ جلد۲، ص۲۷۴

۲۶۔ جلد۱، ص۳

۲۷۔ جلد۱، ص۱۸۱

۲۸۔ جلد۲، ص۱۷

۲۹۔ جلد۱، ص۱۸۲

۳۰۔ جلد۱، ص۱۹۱

۳۱۔ جلد۱، ص۸۳۴

۳۲۔ جلد۱، ص۱۱

۳۳۔ جلد۱، ص۶۰

۳۴۔ جلد۲، ص۱۰

۳۵۔ جلد۱، ص۱

۳۶۔ جلد۴، ص۶۹۸

۳۷۔ جلد۲، ص۸۰۲

۳۸۔ جلد۱، ص۱۳۶

۳۹۔ جلد۳، ص۱۵۷

۴۰۔ جلد۲، ص۷۴۴

۴۱۔ جلد۲، ص۱۲۳

۴۲۔ جلد۳، ص۲۴۴

۴۳۔ جلد۲، ص۲۲۸

۴۴۔ جلد۲، ص۳۷

۴۵۔ جلد۲، ص۱۹۵

۴۶۔ جلد۲، ص۳۱۱

۴۷۔ جلد۱، ص۳۴۶

۴۸۔ جلد۲، ص۴۵۵

۴۹۔ جلد ۴، ص ۸۳۹

۵۰۔ جلد ۱، ص ۳۲

۵۱۔ جلد ۲، ص ۱۶۹

۵۲۔ جلد ۱، ص ۱۶۶

۵۳۔ جلد ۲، ص ۴۹۹

۵۴۔ جلد ۲، ص ۲۷

۵۵۔ جلد ۲، ص ۷۰

۵۶۔ جلد ۱، ص ۳۹

۵۷۔ جلد ۲، ص ۳۹

۵۸۔ جلد جلد ۲، ص ۱۲۵

۵۹۔ جلد ۲، ص ۵۹۲

۶۰۔ جلد ۳، ص ۶۱۱

۶۱۔ جلد ۲، ص ۴۶۵

۶۲۔ جلد ۳، ص ۸۱

۶۳۔ جلد ۱، ص ۲۳۰

۶۴۔ جلد ۱، ص ۲۱۷

۶۵۔ جلد ۱، ص ۶۱

۶۶۔ جلد ۱، ص ۹۴

۶۷۔ جلد ۲، ص ۵۲۵

۶۸۔ جلد ۱، ص ۶۲۰

۶۹۔ جلد ۳، ص ۶۹۷

۷۰۔ جلد ۲، ص ۳۹۶

۷۱۔ جلد ۱، ص ۱۴

۷۲۔ جلد ۱، ص ۱۴